گھبرانا نہیں .....کرونا کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں!

تحریر: سہیل احمد لون

ایسٹر کے بعد رمضان کی رونقیں بھی کرونا وائرس کی وحشت گردی کا شکار ہو رہی ہیں اور لگتا یہی ہے کہ اس مرتبہ میٹھی عید بھی پھیکی ہو جائے گی۔ چار ماہ میں کرونا وائرس دنیا میں ایسا خوف و ہراس پھیلا چکا ہے جس کا تصور شائد کسی نے نہ کیا ہو، اس میں سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جب کرونا وائرس کا مریض ہسپتال میں داخل ہوتا ہے تو اس کی بیمار پرسی کے لیے گھر کے افراد کو بھی نہیں جانے دیا جاتا اور اگر وہ کرونا سے جنگ ہار جائے تو اس کی تدفین بھی عمومی انداز میں نہیں ہوتی۔ چار ماہ میں دنیا کی معیشت بری طرح متاثر ہو چکی ہے اور ابھی پتہ نہیں کہ یہ سلسلہ کب رکے گا؟ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو الہی عذاب اور قدرتی آفات کی بھی ایک لمبی تاریخ ہے، کرونا سے قبل بھی مختلف قسم کے وائرس انسانی جانوں کا ضیاع کر چکے ہیں، کرونا وائرس بھی اسی کا ایک تسلسل ہے اور ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی بنی نوع انسان کو کسی اور قسم کے وائرس کا سامنا کرنا پڑے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کرونا وائرس نے بلا امتیاز اور بلا تفریق ہر کلاس کی زندگی کو متاثر کیا، اس نے کسی کا مذہب، رنگ، نسل، رتبہ، مالی حیثیت، فرقہ، قومیت یا جنس نہیں پوچھی بلکہ سب کو اپنی پلیٹ میں لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غریب آدمی کو کرونا وائرس سے زیادہ اس بات کی فکر ہے کہ وہ اپنا چولہا کیسے جلائے گا؟ صاحب حیثیت لوگ تو گھروں میں راشن ڈال کر اپنے بچوں کیساتھ وقت گزار رہے ہیں ان کی پریشانی یہ تو ہو سکتی ہے کہ گرمیوں میں وہ چھٹیاں منانے کسی پہاڑی مقام یا ٹھنڈے ملک نہیں جا سکیں گے مگر ان کو روٹی کے لالے نہیں پڑے۔ قدرت کا ایک بنیادی اصول ہے کہ ہر چیز جوڑے کی صورت میں پیدا کی اور ہر چیز کا ایک متضاد بھی بنایا۔ جہاں دن ہے وہاں رات بھی بنائی، زندگی کی گاڑی اپنی منزل مقصود کی طرف جس پٹری پر رواں دواں ہوتی ہے ان میں ایک خوشی اور دوسری غم کی لائن ہوتی ہے، یعنی زندگی میں اتار چڑھاؤ، فائدہ نقصان، مصیبت آسانی، خوش قسمتی بدقسمتی وغیرہ ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور یہی اصول ہر جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ الیکٹریکل اور الیکٹرانکس میں بھی مثبت اور منفی ساتھ ساتھ چلتے ہیں، سیاست ہو یا فلسفہ اس میں بھی Thesis اور Antithesis دیکھے جا سکتے ہیں۔ قدرت کے اصول کو اگر کرونا وائرس کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس میں بھی ہمیں کئی مثبت چیزیں دیکھنے اور سیکھنے کو ملتی ہیں۔ سب سے پہلے تو انسان کو کرونا وائرس نے یہ بتا دیا ہے کہ حاکمیت اللہ تعالی کی ہے اور ہم جتنی مرضی ترقی کر لیں اور دنیا تسخیر کرنے کے دعوے کرنا شروع کر دیں مگر ہماری پہنچ اور اختیارات بہت محدود ہے۔ انسان کو اللہ نے ایک دوسرے سے پیار کرنے کے لیے بنایا مگر ہم نے چیزوں سے پیار، انسانوں کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مادیت پرستی میں ہم اتنا آگے چلے گئے تھے کہ شاید رب العالمین کو ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے کرونا وائرس جیسی آفت کو پھیلانا پڑا۔ کرونا وائرس سے جہاں انسان کو اپنی اوقات کا پتہ چلا وہاں کئی اور مثبت پہلو بھی ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں سے فضائی آلودگی میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا تھا اور اس پر قابو پانے کی کئی تدابیر اختیار کی گئیں جس میں گاڑیوں کو مکمل طور پر بجلی یا بیٹری سے چلانے کے منصوبے پر کام ہونا بھی شامل ہے، کرونا وائرس کیوجہ سے لاک ڈاؤن کرنا پڑا جس سے فضائی آلودگی میں اتنی کمی آئی کہ لاہور اور دہلی جیسے شہروں میں بھی لوگوں نے آسمان پر

تارے دیکھ لیے اور آسمان کا حقیقی رنگ سورج کی روشنی میں دیکھ لیا اسی طرح سمندری آلودگی بھی کم ہوئی ہے ساحل سمدر پر پانی کا رنگ ہی بدل گیا ہے، وہاں سمیت دیگر گنجان آباد شہروں میں پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ امریکہ، برطانیہ، یورپ سمیت دیگر ترقہ یافتہ ممالک کا طبی نظام ننگا ہونے سے اس بات کا احساس ہوگیا کہ پیسہ جنگ وجدل اور اسلحہ سازی کی بجائے انسانوں پر لگایا جاتا تو آج انکے ہیلتھ سسٹم کو اتنی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا، اس بات کا بھی احساس ہوگیا کہ فٹبالر اور اداکار ہی نہیں بلکہ ایک ہیلتھ ورکر بھی ملک و قوم کے لیے ہیرو ہوتا ہے۔ امریکہ بہادر کو بھی یہ پتہ چل گیا کہ چین نے بغیر کوئی گولی چلائے وہ کام کرلیا ہے جو وہ گزشتہ تین دہائیوں میں تیرہ جنگیں مسلط کرکے بھی حاصل نہ کرسکے۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے والدین کو بچوں کیساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع مل گیا، گھر کام والی نہ آنے کی وجہ سے اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کا مزہ بھی لے لیا، میاں بیوی کو زیادہ وقت ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع مل گیا، بچوں کو ٹیوشن یا اکیڈیمی بھیجنے کی بجائے انکے ہوم ورک میں مدد کرنے کا موقع مل گیا، شادی بیاہ نہایت سادگی سے چار بندوں کے ساتھ بھی ہوسکتے ہیں اس کا تجربہ بھی ہوگیا، کھلاڑی، فنکار، اداکار، فلم انڈسٹری سے جڑے پیشہ ور ہدایت کار، فلمساز، ایڈیٹر وغیرہ کو بھی اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنے کا وقت مل گیا جو ان کے نصیب میں بہت کم ہوتا تھا، بازار بند ہونے کی وجہ سے خصوصاً خواتین کو پتہ چل گیا کہ بندہ شاپنگ کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اور بیوٹی پارلر سے اضافی بناؤ سنگھار کیے بغیر بھی انکے چاہنے والے انکو قبول کرسکتے ہیں، غریب ماں باپ اس مرتبہ بھی اپنے بچوں کے لیے نئے کپڑے جوتے اور دیگر اشیاء کی خریداری نہ کرسکیں گے لیکن کم از کم بچوں کے سامنے لاک ڈاؤن کا بہانہ تو بنا سکیں گے، عبادات کیساتھ تعمیری اور تخلیقی کام کرنے کے لیے وافر وقت بھی مل گیا۔ فائیو سٹار ہوٹلوں میں افطار پارٹیاں نہیں ہونگی تو ہوسکتا ہے اشرافیہ میں یہ احساس بھی پیدا ہوجائے کہ اگر اسی پیسے سے غریبوں کے گھر راشن ڈال دیا جائے جس سے وہ کئی دن تک سحری افطاری کرسکتے ہیں اور شاید آئندہ رمضان میں افطار پارٹی Status symbol نہ رہے۔ گھر رہنے سے اپنے بزرگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا بھی وقت مل رہا ہے، ورنہ مادیت پرستی کے دور میں ایسی ریس لگی تھی کہ بزرگ اپنے بچوں سے بات کرنے کو ترس جاتے تھے۔ لاک ڈاؤن کے بعد سٹریٹ کرائمز، ڈکیتی، اغواء برائے تاوان اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں کمی آئی، صفائی کا خاص خیال رکھا جانے لگا اب تو گورے بھی ہاتھ دھونا شروع ہوگئے ہیں ورنہ وہ تو کھانے کی میز پر بھی ٹشو پیپر سے ناک صاف کرنے کے بعد کھانا جاری رکھتے تھے، یورپ اور امریکہ میں سڑکوں پر لاؤڈ سپیکر سے اذانیں دی گئیں عام حالات میں یہاں مسجد سے باہر اذان کی آواز آنے پر پابندی ہے، روڈ ایکسیڈنٹ بہت کم ہوگئے۔ پاکستان میں دراصل لاک ڈاؤن کے بعد شرح اموات میں کمی آئی ہے، لوگوں نے باہر گندے ماحول میں بنا مضر صحت کھانا اور فاسٹ فوڈ کھانے کی بجائے گھر میں صاف ستھرے ماحول میں بنا کھانا شروع کیا جس سے کئی بیماریاں کم ہوئیں کچھ ممالک میں بلی کتے وغیرہ کھانے پر پابندی لگائی گئی، بلاسود قرضے دیئے گئے، شراب خانے بند ہونے سے شراب نوشی میں کمی ہوئی اور ڈسکو کلب بند ہونے سے لڑائی جھگڑے کے واقعات نہیں ہوئے، تمباکو نوشی میں بھی کمی ہوئی چند ممالک نے سگریٹ اور شراب مزید مہنگی کردی۔ لوگوں کو نپی تلی اور اشد ضرورت کی شاپنگ کرنے کا تجربہ ہوا۔ آئندہ بجٹ بناتے وقت حکومت وقت کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ جیسے کوئی فوجی میدان جنگ میں بندوق، ٹینک، میزائل یا کوئی فائیٹر پائلٹ بہتر ٹیکنالوجی والے جہاز کیساتھ اچھے نتائج دیتا ہے اسی

طرح ہیلتھ سٹاف اور ڈاکٹرز کو بھی جدید طبی آلات درکار ہوتے ہیں جس سے وہ مریض میں گھسی بیماریوں سے جنگ کرکے انکی جان بچا سکیں لہذا صحت پر بجٹ زیادہ ہونا چاہیئے۔اس بات کا بھی احساس ہوگیا کہ ہم Pandemic سے نبٹنے کے لیے آئندہ اپنے آپکو کیسے تیار کرسکتے ہیں جس سے انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی معیشت بھی بچائی جاسکے؟ رمضان المبارک برکتوں والا مہینہ ہے اور ہمیں موقع ملا ہے کہ رب کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اس سے رحمت، بخشش اور مغفرت مانگیں۔کوشش کریں کہ ایسے کام کریں کہ جس سے دوسروں کے دلوں سے بھی ہمارے لیے دعا نکلے۔مشکل وقت ہمیں بہت کچھ سکھاتا ہے، مصیبت کی گھڑی میں مومن کا ایمان وتقوی اور بھی مضبوط ہوجاتا ہے۔اللہ تعالی بھی صبر اور برداشت کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے لہذا گھبرانا نہیں کرونا سے بچنا ہے اور اس مشکل وقت سے منفی باتوں سے اپنے اعصاب تباہ نہیں کرنے بلکہ اس میں مثبت پہلو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا ہے اور دعاؤں میں شدت لاکر اپنے رب کو منانے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ ہم آزمائش کی اس گھڑی میں سرخرو ہوسکیں۔شاعر مشرق علامہ اقبال نے تو اپنے شاہینوں کو یہی درس دیا تھا۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اڑانے کے لیے

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

01-05-2020

غریب الوطنی اور معذوری

تحریر: سہیل احمد لون

گزشتہ دنوں میں چھٹیاں گزارنے ہمشیرہ کے پاس ہالینڈ گیا۔اس کے چار بچوں میں سے ایک بیٹا علی تیمور ذہنی وجسمانی اور بیٹی زینہ جسمانی معذور ہیں۔میں ان بچوں سے چند برس قبل پاکستان میں بھی ملا تھا جہاں زینہ احساس کمتری میں اس قدر مبتلا تھی کہ مجھے گھر میں دیکھ کر دوسرے کمرے میں جا کر چھپ گئی اور میرے بلانے پر بھی سامنے آنے سے ہچکچاتی تھی۔بہن کو گھر کا دروازہ اندر سے لاک رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اگر علی گھر سے باہر نکل جاتا تو ذہنی معذوری کی وجہ سے اس قابل نہیں تھا کہ تھا کہ وہ اپنے گھر کا راستہ یاد رکھ سکے یا اپنے گھر والوں کا نام پتہ بتا سکے۔چند بار وہ گم بھی ہو چکا تھا۔علاقے میں سپیشل بچوں کا کوئی سکول نہیں تھا ان کو ایک پرائیویٹ سکول میں داخل کروایا مگر وہاں اکثر بچے ان کا مذاق اڑاتے۔ظاہر ہے یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے جہاں کسی کی آنکھ چاہے کسی حادثے میں ضائع کیوں نہ ہوئی ہو اسے ''کانا''،کسی کی ٹانگ خراب ہو جائے تو اسے ''لنگڑا''،کسی کا وزن بڑھ جائے تو وہ ''موٹا''،کوئی داڑھی رکھ لے تو وہ ''مولوی''،کوئی ذہنی معذور ہو تو اسے ''سائیں''،کوئی زیادہ سانولہ ہو تو اسے ''کالا''،اگر زیادہ گورا ہو تو اسے ''صاحب''،قد چھوٹا رہ جائے تو ''موچھا یا بونا'' یعنی اصل نام بھول کر اس کی شخصیت یا خدوخال میں سے کسی چیز کو بنیاد بنا کر اس کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔اسی طرح کسی شخص کا پیشہ بھی اس کے نام کے طور پر پکارا جاتا ہے مثلاً ٹانگے والا،رکشے والا،لوہار،رہڑھی والا،ماسٹر،استانی،فوجی وغیرہ۔مہذب معاشروں میں کسی کو ایسے پکارنا جس سے اس کی دل شکنی ہو ایک اخلاقی جرم تصور کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر برطانیہ میں کوئی شخص چوری کرتا رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو اس کے خلاف اتنی سخت کارروائی نہیں کی جائے گی مگر وہ کسی پاکستانی کو ''پاکی'' یا کسی اپاہج کو ''لنگڑا یا کانا'' کہتا ہوا پکڑا جائے تو اس سے آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے۔زینہ اور علی کا سکول میں بچوں کی ٹیڑھی باتوں سے دل دکھتا،اگر دروازے میں بیٹھ کر محلے کے دیگر بچوں کو کھیلتا دیکھتے تو بچے ان کی معذوری کا ایسا مذاق بناتے کہ وہ احساس محرومی اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر کسی کے سامنے آنے سے کترانا شروع ہو گئے۔اولاد کی تندرستی ہر ماں باپ چاہتا ہے مگر کسی کے ہاں کوئی بچہ نارمل نہ ہو تو اس میں ان کا کیا قصور مگر ہمارے معاشرے میں لوگ اکثر ان کو ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ ان کا دل جلنا شروع ہو جاتا تھا۔مگر دل جب جلتا ہے تو اس کا شعلہ نہیں اٹھتا اور اس کا دھواں انسان کے اندر ہی گرتا ہے جس سے باقی اعضاء بھی متاثر ہوتے ہیں۔اب وہی بچے ہالینڈ میں ہیں اور ان کے والدین کو کسی نے یہ احساس نہیں دلایا کہ ان کے دو بچوں میں کوئی معذوری ہے۔بلکہ ان دونوں بچوں کو دوسرے دونوں صحت مند بچوں سے زیادہ پیار اور شفقت برتی جاتی ہے۔علی اور زینہ کو سپیشل بچوں کے سکول میں داخلہ مل گیا صبح گھر سے گاڑی لیکر جاتی اور سہ پہر کو بچے گھر چھوڑے جاتے۔پہلے دن جب سکول میں گئے تو والدین کو بھی ساتھ بلایا گیا اور سکول کی وزٹ کروائی گئی۔سکول کا نظام دیکھنے اور ذکر کرنے کے قابل تھا۔وہاں پر انسانوں کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ کتے بھی کام کر رہے تھے۔ہم دیسی لوگوں کو دیکھ کر دیکھتے رہنے کی بھی بری عادت ہے،جب

کتوں کے متعلق بتایا گیا کہ یہ ان بچوں کے ساتھ ڈیوٹی پر معمور کیے جاتے ہیں جن کو ہر وقت مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ مخصوص تربیت یافتہ کتے ان بچوں کا دھیان رکھتے ہیں ان کے لیے کام بھی کرتے ہیں۔ کتوں کی خوبیاں بیان ہو رہی تھیں تو حسب عادت بہنوئی اور بہن نے کتوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا تو ہیڈ ٹیچر نے کہا کہ برائے مہربانی کتوں کو ایسے ٹکٹکی باندھ کر نہ دیکھیں ورنہ وہ مائنڈ کر جائیں گے اور ہم کسی کی دل شکنی کرنا جرم تصور کرتے ہیں چاہے وہ کوئی حیوان ہی کیوں نہ ہو۔ سکول کے ماحول میں چند دن گزارنے کے بعد بچوں کا اعتماد اتنا بحال ہوا کہ وہ میرے ساتھ اپنے سکول میں ہونے والے واقعات خوشی سے شیئر کر رہے تھے۔ علی جسے پاکستان میں ملنگ، درویش اور سائیں سمجھا جاتا تھا مجھے ڈچ زبان میں گنتی اور رنگوں کے نام بتا رہا تھا، زینہ پیانو پر دھن بنا کر سنا رہی تھی اور ساتھ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ آرٹسٹ بنے گی۔ وہ اس بات پر بے حد خوش تھی کہ ان کی معذوری کا یہاں کبھی کسی نے مذاق نہیں بنایا اور نہ کسی نے ان کو یہ احساس دلایا ہے کہ ان میں کسی چیز کی کمی ہے، بچوں کی معذوری کا کیس کیونکہ بہت پیچیدہ تھا اس لیے انہوں نے ماں باپ سے اجازت لیکر اس پر باقاعدہ ریسرچ کرنا شروع کر دی جس کے لیے ان کو امریکی کنسلٹنٹس سے بھی مشورے کرنا پڑے۔

اسی طرح آنکھوں سے معذور گوجرہ۔ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر عامر علی ماجد برطانیہ میں آ کر ایل۔ ایل۔ بی آنرز، ایل ایل ایم لندن، ڈپلومہ ان ائیر سپیس لاء، ڈاکٹر آف سول لاء بیرسٹر، کرنے کے بعد لندن میں امیگریشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور قانون کی کتابوں کے مصنف بھی بنے، اپنی بھرپور کامیابی کا کریڈٹ ڈاکٹر صاحب برطانوی نظام اور معاشرے میں معذور افراد کے لیے یکساں مواقع کے قوانین کو دیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب لاہور میں ہوتے تو شاید کب کے نابینا افراد پر لاٹھی چارج میں اپنا حصہ لے چکے ہوتے۔

ہمارے سیاسی اکابرین ہوا خوری، چندہ خوری، اور علاج کے لیے لندن آتے رہتے ہیں بلکہ کچھ سیاسی قائدین کا تو اپنا دوسرا گھر بھی لندن ہے جہاں انکی نسل پروان چڑھ رہی ہے، ان کو یہاں کے قانون قاعدے اچھی طرح پتہ ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں کہ یہاں انسان کے ساتھ حیوان کے حقوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کاش! ہمارے سیاسی اکابرین اور اشرافیہ کم از کم انسان بن کر دوسرے انسانوں کے لیے بھی وہی سوچ رکھیں جو وہ اپنے اور اپنے ایل عیال کے لیے رکھتے ہیں۔ کاش! ہمارے معاشرے میں بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ معذور افراد بھی جذبات رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت کا مذاق بنانے کی بجائے ان کو یکساں مواقع دے کر معاشرے میں اعلی مقام حاصل کرنے میں مدد کرنی چاہیے۔ علی اور زینہ وطن عزیز سے کئی تلخ یادیں لے کر ہالینڈ میں آباد ہو گئے ہیں مگر اب بھی ہر گلی میں کوئی علی یا زینہ ہو گی جسے لوگ تند نظروں اور طنزیہ باتوں سے گھائل کرتے ہونگے۔ اس وقت دہشت گردی، معاشی دہشت گردی اور سیاست گردی جیسے مسائل پر قابو پانے کی باتیں کی جاتیں ہیں مگر اخلاقیات کی دہشت گردی پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ تمام قسم کے مسائل اخلاقی پستی سے ہی جنم لیتے ہیں اور اخلاقی پستی معاشی پستی سے جڑی ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی خوش حال ہونے کے بارے چونکہ کوئی پلان نہیں بنایا تو ہر روز نکلنے والا سورج ہمیں بھوک کی نوید سناتا ہے اور ڈوبتے سورج کے ساتھ ہماری بہت سی خواہشیں بھی ڈوب جاتی ہیں۔ حقیقت میں قدرت کے طرف معذور ہونا کوئی عیب نہیں کہ ابھی انسان اور پھر تیسری دنیا کا انسان تو اس کے سامنے بے بس ہی ہے۔ اصل معذوری تو اُن ذہنوں کی ہے جو تندرست ہونے کا دعوی کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اُنہوں نے ہر ذہن کو معذور بنا دیا ہے۔ ہر ریاست کی پہلی ذمہ داری اپنے

شہریوں کا ذہنی معیار زندگی بلند کرنا ہوتا ہے تا کہ وہ دوسرے انسانوں سے مل جل کر زندگی بسر کر سکیں اور کسی کی معذوری کا مذاق بنانے کے بجائے اُسے عام شہری سمجھتے ہوئے اپنے بہترین سلوک سے پیش آئیں۔ معذوری جسموں میں نہیں اُن انسانی ذہنوں میں ہوتی ہے جن کی ریاست تربیت نہیں کرتی ورنہ ہالینڈ اور لاہور میں انسان ہی بستے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان ریاستوں نے اپنے شہریوں کی بھرپور تربیت کر رکھی ہے اور ہم ابھی تک اُن کی تربیت بھی نہیں کر سکے جنہوں نے ریاست چلانی ہوتی ہے۔ بدترین معیشت نے پہلے ہی ہر پاکستانی کو ذہنی معذور بنا رکھا ہے اور دوسری طرف ریاست کی اپنے شہریوں کی تربیت نہ کرنے کی رسم نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ کوئی شخص اپنے مٹی کو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن جو مٹی اپنے لوگوں کو روزگار اور تعظیم نہیں دیتی لوگ پہلے اُس سے لاتعلق ہوتے ہیں اور پھر اُسے خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ اور سینہ پاکستانیوں پر فخر کرنے والوں کے علم میں ہونا چاہیے کہ وہ کسی شوق میں نہیں بلکہ اپنے ملک کی معاشی معذوری کی وجہ سے غریبی الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

18-01-2020